"علماءِ امّتی" کا شرعی مفہوم

تحریر: مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی امّت کے علمار کو اعزاز و اکرام سے نوازتے ہوئے ایک موقع پر فرمایا:

عُلَمَاءُ اُمَّتِیْ کَاَنْبِیَاءِ بَنِیْ اِسْرَائِیْل — "میری امت کے علمار بنی اسرائیل کے پیغمبروں جیسے ہیں۔"

یعنی ذمّہ داری اور درجہ دونوں کے لحاظ سے — میرے بعد نبوّت ختم ہو چکی، اب دین کی تعلیم و تبلیغ کا فریضہ میری امّت کے علمار انجام دیں گے، اس لیے ان کا درجہ خدا کے ہاں بھی بنی اسرائیل کے پیغمبروں کے برابر ہوگا۔

بنی اسرائیل میں تبلیغِ دین کا کام نبی کرتے تھے اور ایک ایک نبی کے نائب اس کی حیات میں بھی اور اس کے بعد بھی کثرت سے مقرر کر دیے جاتے تھے، جیسے اصلی نبی (صاحبِ وحی) حضرت موسےٰ علیہ السلام تھے اور ان کے بڑے بھائی حضرت ہارونؑ ان کے نائب نبی مقرر کیے گئے تھے — اسی طرح حزقیل نبی، سموئیل نبی، یسعیاہ نبی تھے — جو حضرت موسےٰؑ کے نائب کے طور پر توراۃ کی شریعت پھیلاتے تھے —

رسولِ اکرمؐ نے دوسرے موقع پر فرمایا:

اَلْعُلَمَاءُ وَرَثَۃُ الْاَنْبِیَاءِ — حضراتِ انبیار کے وارث علمار ہوتے ہیں —

کیونکہ انبیارؑ کا حقیقی ورثہ علم ہے، دولت نہیں —

سوال یہ ہے کہ ان احادیث میں علمار کا لفظ کیا مفہوم رکھتا ہے؟ اگر علمار کا مفہوم وہی ہے جو آج ہمارے عرف و محاورہ میں استعمال ہوتا ہے، یعنی دین کے پڑھنے

پڑھانے والے لوگ، تو پھر اس فضیلت سے صوفیائے ربّانی کی جماعت نکل جاتی ہے، کیونکہ صوفیا، وہ حضرات ہیں جو دینی تربیت وتزکیہ کے ذریعہ دین پھیلاتے ہیں حالانکہ جس طرح دینی تعلیم رسولِ پاکؐ کے فرائض نبوّت کا ایک حصّہ تھا، اسی طرح دینی تربیت بھی آپؐ کے پیغمبرانہ مشن کا ایک حصّہ تھا۔ قرآن کریم نے کہا:

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ـ	"وہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم انہیں کتابِ الٰہی اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور (اس کتاب کے مطابق) ان کی (ذہنی اور عملی) تربیت کرتے ہیں۔"

اب ہمیں لفظِ علمار کا مفہوم متعیّن کرنے کے لیے قرآن کریم کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ قرآن کریم میں علمار کا لفظ دو مقام پر آیا ہے۔ سورۃ الشعراء (۱۹۷) میں بنی اسرائیل کے علمار کا ذکر ہے:

اَوَلَمْ يَكُنْ لَهُمْ اٰيَةً اَنْ يَعْلَمَهُ عُلَمٰٓؤُا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ـ	"کیا اہلِ مکہ کے لیے یہ دلیل اور نشانی کافی نہیں کہ (قرآن کے نزول کی خبر کا) بنی اسرائیل کے پڑھے لکھے لوگ علم رکھتے ہیں؟"

دوسرا مقام سورۃ الفاطر (۲۸) ہے۔ وہاں فرمایا گیا:

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا	"اللہ تعالےٰ سے وہی لوگ ڈرتے ہیں جو سمجھ والے ہیں۔"

اربابِ تراجم علمار میں صرف شاہ عبدالقادر صاحب محدّث دہلویؒ وہ بزرگ ہیں جو الہامی علم کی مدد سے کتابی علم کے اسرار و رموز کھولتے ہیں اور کتابِ الٰہی کے عربی الفاظ کا شرعی اور مرادی مفہوم اردو میں بیان کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے پہلی آیت میں علماء کا لغوی اور عام مفہوم لکھا، یعنی پڑھے لکھے لوگ، وہ لوگ جن کے پاس کتابی معلومات ہیں اور وہ لوگ کتابوں کے الفاظ اور کتابوں کی عبارت پڑھ لیتے ہیں اور لکھ لیتے ہیں لیکن شاہ صاحب

نے دوسری آیت کے ترجمہ میں علماء کے لفظ کا شرعی اصطلاحی مفہوم تحریر کیا ہے۔ پھر شاہ صاحب نے "سمجھ" کو عام اور مطلق رکھا ہے، دین کے ساتھ خاص نہیں کیا۔ یعنی دین اور دنیا دونوں کی سمجھ، دین اور دنیا دونوں کی حقیقت کا عرفان، دونوں کی گہرائی اور تہہ کا شعور۔

قرآن کریم نے دین اور دنیا دونوں پر غور و فکر کرنے کا حکم دیا ہے۔ دنیا کے لیے کہا:

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (آل عمران: ۱۹۱)

"اور وہ آسمان اور زمین کی پیدائش پر غور کرتے ہیں۔"

دین کے لیے کہا:

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ (النحل: ۴۴)

"(اے نبی محترم!) ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب ذکر نازل کی تاکہ تم ان ہدایات کی تشریح و بیان کا کام کرو جو تمہاری طرف اتاری گئی ہیں تاکہ وہ لوگ ان پر غور کریں۔"

غور و فکر یہ کہ یہ دنیا اور اس کی نعمتیں خدا کی طرف سے امانت ہیں، ان کا شکر ادا کرنا ضروری ہے اور اس معبودِ برحق اور خالق کے شکر ادا کرنے کا طریقہ ہی مذہب کہلاتا ہے۔

ظاہر بات ہے کہ خشیّتِ الٰہی (جس کا تعلّق قلبی کیفیت سے ہے) انہی لوگوں کے اندر ہوتی ہے جو دین کا فہم اور شعور رکھتے ہیں اور دین کی حقیقت کو سمجھتے ہیں — قرآن و حدیث کے جاننے والوں (جانکاروں) میں عیسائی دنیا کے اندر کثرت سے لوگ موجود ہیں جنہیں اصطلاح میں مستشرق کہا جاتا ہے — وہ جانکار ہیں، لیکن سمجھدار نہیں۔ ان کے پاس قرآن و حدیث کے ظاہر کا علم ہے — کتابی علم ہے — ان کے پاس قرآن و حدیث اور شریعت کے باطن اور اس کی روح کا شعور و فہم حاصل نہیں۔ اس لیے وہ خشیتِ الٰہی سے خالی ہیں۔

قرآن کریم نے علم کے ساتھ دو لفظ اور بھی استعمال کیے ہیں۔ ایک لفظ بصیرت،

دوسرا لفظ حکمت ۔ سورۃ البقرۃ (۲۶۹) میں کہا گیا:

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا ۝	" اور جسے سمجھ دی گئی اسے خیرِ کثیر عطا کی گئی ۔"

سورۂ یوسف (۱۰۸) میں کہا گیا:

قُلْ هَٰذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ ، عَلَىٰ بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي	" (اے نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم!) تم یہ اعلان کردو کہ یہ میرا راستہ ہے۔ میں اور میرے پیرو اس کی طرف سمجھ بوجھ کر تمہیں بلاتے ہیں۔"

ابتدائے اسلام میں علمِ ظاہر اور علمِ باطن دونوں ایک ہی شخصیت میں جمع تھے اس لیے اصحابِ درس اصحابِ اخلاق ۔۔۔ معلّم اور مزکّی ۔۔۔ دونوں کے لیے علماء کا لقب استعمال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ قرآن کریم نے اس امّت کے امام و ہادی کے مشن (کارِ نبوّت) کے دونوں جزو مقرّر کیے ہیں:

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۔	" وہ نبیؐ، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتے ہیں اور ان کی اخلاقی اور روحانی تربیت کرتے ہیں۔"

رسولِ اکرم صلّی اللہ کی براہِ راست تعلیم و تربیت نے علماءِ کاملین پیدا کیے جو بیک وقت تعلیم اور تزکیۂ اخلاق کا فرض ادا کرتے تھے۔ پھر بعد کے عہد میں تقسیمِ کار کے تحت علماءِ ظاہر اور علماءِ باطن کے دائرے الگ الگ ہو گئے۔ ایک جماعت نے کتاب و سنّت کی تعلیم و تدریس کا میدان سنبھالا۔ یہ محدّث، فقیہ اور متکلّم و قاضی کہلائے اور ایک جماعت نے اخلاقی اور روحانی تربیت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ یہ صوفیائے ربانی اور مشائخ کہلائے۔ عُرفِ عام میں علماء اور اہلِ علم کا لقب محدّثین و فقہاء کے ساتھ خاص ہو گیا۔ اور اخلاقی معلّمین کے لیے صوفیاء اور اہلِ حقیقت کی اصطلاح قرار پاگئی۔

کارِ نبوّت کے دو اجزاء ـــ تعلیم، تربیت

نادان یہ سمجھتے ہیں کہ شریعت اور طریقت دو متضاد اور ایک دوسرے کے خلاف محاذ ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ تعلیم و تدریس اور تربیت و تزکیہ دونوں کارِ نبوت کے جزو ہیں۔ علماء اور صوفیاء کے دائروں کی تقسیم آپس کے جھگڑے کی وجہ سے عمل میں نہیں آئی بلکہ جب دعوت و تبلیغ کا کام وسیع ہُوا تو تقسیمِ کار کے تحت اپنے ذاتی ذوق کے مطابق علماء اور صوفیاء الگ الگ بیٹھ گئے اور مدرسہ اور خانقاہ کے دو میدانِ عمل وجود میں آ گئے۔

علمِ ظاہر اور علمِ باطن کی قرآنی تعبیر

قرآنی تعبیر کے مطابق اس علم کو علمِ باطن کہا جا سکتا ہے۔ قرآن نے منکرینِ حق کے متعلق کہا:

یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ	"یہ لوگ دنیا کے ظاہر کا علم رکھتے
الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَهُمْ	ہیں اور آخرت (یعنی اس کے انجام
عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ ۝	اور اس کی حقیقت) سے بے خبر
(الروم : ۷)	ہیں ـ"

ظاہر کے مقابلہ میں باطن کا لفظ آتا ہے۔ شاہ صاحب نے ظاہر کا ترجمہ "اوپر اوپر" کیا ہے۔ یعنی یہ منکرین دنیا کی زندگی کی اوپر اوپر کی باتوں کا علم رکھتے ہیں۔ اگر اندر کی باتوں کا انہیں علم ہوتا تو یہ آخرت پر ایمان لے آتے۔

یہ حقیقت کھلی ہوئی ہے کہ انسان دنیا سے آخرت کی طرف جاتا ہے۔ ظاہر سے باطن کی طرف پہنچتا ہے، اس لیے جہاں باطن کا علم ہو گا وہاں ظاہر کا علم بھی ہو گا ـــ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جہاں ظاہر کا علم ہو، وہاں باطن کا علم بھی ہو۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ قرآن کریم کا پڑھنے پڑھانے والا، اس کے الفاظ کا مطالعہ کرنے والا ضروری نہیں کہ اس کے معانی و مطالب کا علم بھی ہو، لیکن قرآن کے معانی (باطن) کا عالِم

(فقیہہ) اس کے الفاظ و عبارت کا جاننے والا ضرور ہوگا۔ عبارت و الفاظ ہی سے معانی کی طرف پہنچ ہوسکتی ہے۔

دوسری مثال یہ ہے کہ شریعت کے بعد ہی طریقت کی طرف پہنچ ہوتی ہے۔ پہلے شریعت اور اس کے بعد طریقت ـــ طریقت اور تصوّف کے معنی ہیں شریعت کے اسرار و رموز اور شریعت کے اصلی مقصد (اخلاقی حسن و جمال) کا علم حاصل ہونا، چنانچہ اب بات صاف ہوگئی کہ قرآن و حدیث میں علماء کے اصطلاحی معنی علماءِ کاملین ـــ ظاہر اور باطن دونوں کے عالم مراد ہیں۔ ظاہر کے عالم اصحابِ درس و تعلیم اور باطن کے عالم مشائخ اور صوفیاء ہیں۔

علمِ باطن اور علمِ ظاہر میں ٹکراؤ

ظاہر اور باطن کے مندرجہ بالا مفہوم سے یہ بات صاف ہوجاتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان ٹکراؤ اور تضاد نہیں ہے۔ ایک طبقہ علماء اور صوفیاء کے درمیان اختلافِ ذوق اور تقسیمِ کار کی ذمے داری کو سمجھے بغیر یہ کہتا ہے کہ کوئی معلّمِ کتاب و سنّت صوفی نہیں ہوسکتا اور جو حضرات اصلاحِ اخلاق اور روحانی ترقی کا کام کرتے ہیں ان کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ کتاب و سنّت کے علم سے تہی دامن ہیں۔

علمِ ظاہر اور علمِ باطن کے درمیان جو تعلق ہے اسے سیّد علی ہجویریؒ (داتا گنج بخش لاہوری) نے اپنی کتاب "کشف المحجوب" میں ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

> "علمِ ظاہر میں لوگوں کے ساتھ معاملات کی درستگی اور علمِ باطن میں نیّت کا صحیح رکھنا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کا قیام دوسرے کے بغیر ناممکن ہے، کیونکہ ظاہر حال باطنی حقیقت کے بغیر نفاق ہے۔ اسی طرح باطن ظاہر کے بغیر زندقہ ہے۔ ظاہر شریعت باطن کے بغیر ناقص ہے اور باطن بغیر ظاہر کے ہوس ہے۔" (ص ۲۷)

علمِ ظاہر اور علمِ باطن کے درمیان ٹکراؤ اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی جانب

غلواور تشدد رونما ہوتا ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ باطن کا جوش اور محبّت وعقیدت کی افراط انسان کو بے ساختہ اپنے محبوب کے قدموں میں جھکا دیتی ہے۔ اِسے قدم بوسی اور دست بوسی کہا جاتا ہے۔ علمِ ظاہر اور علمِ فقہ کا مسئلہ اس عمل کے ظاہری پہلو کو دیکھ کر اسے گناہ قرار دیتا ہے، کیونکہ قدم بوسی کا عمل عبادتِ الٰہی کی خاص ادا یعنی سجدہ کے مشابہ ہے۔ اور گناہ قرار دینے کا مقصد یہ ہے کہ احتیاط کی جائے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ شخص جہنمی ہو گیا۔ یہ اعتدال کی راہ ہے۔ افراط و تفریط کی راہ یہ ہے کہ مفتی و فقیہ یہ کہنے لگے کہ قبر پر جھکنا شرک ہے اور صوفی یہ کہنے لگے کہ قدم بوسی کے بغیر کچھ نہیں ملتا۔

ٹکراؤ کی دوسری مثال یہ ہے کہ جس بزرگ کی یاد میں ہم یہاں جمع ہیں ان کا لقب شیخ محدّث دہلویؒ ہے۔ شیخ کی دینی جدّوجہد پر کتاب وسنّت کی تعلیم وتدریس کا غلبہ تھا، اس لیے ان کا لقب شیخ محدّث پڑ گیا، حالانکہ شیخؒ "قادری صوفی" بھی ہیں۔ شیخ کے دوسرے رفیقِ کار حضرت مجدّد سرہندی ہیں، ان کی سرگرمیوں پر روحانی تربیت اور اخلاقی اصلاح کا غلبہ تھا اس لیے وہ امام ربّانی اور امام الصوفیہ کہلائے۔ امام ربّانی مجدّد الف ثانیؒ کتاب وسنّت کے اس قدر پابند ہیں کہ بدعتِ حسنہ کو بھی سنّتِ نبویؐ کے خلاف سمجھتے ہیں ــــ لیکن ایک مکتوبِ گرامی میں مجدّد صاحب نے معرفت اور علمِ باطن کا ایک خاص نکتہ تحریر میں پیش کر دیا۔ وہ مکتوب جب شیخ محدّث کے علم میں آیا تو آپ نے اس پر سخت تنقید کی ــ اور ظاہر شریعت کے ایک امام وعالم کا یہ فرض تھا جو آپ نے ادا کیا۔ شیخ اور مجدّد صاحب کی وہ خط وکتابت موجود ہے ــ مجدّد صاحب نے اس سے رجوع کیا ہے اور پھر شیخؒ نے معذرت کی ہے۔

علمِ کسبی اور علمِ وہبی

علمِ باطن کو کبھی وہبی علم کے معنی میں بولا جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں کسبی علم کی تعبیر اختیار کی جاتی ہے۔ علم کی یہ تقسیم "مآخذِ علم" کے لحاظ سے ہے۔ یعنی اگر علم حواس

خمسہ (دیکھنے، سُننے، سُونگھنے، چکھنے یا چھونے) سے حاصل ہُوا ہے تو وہ علمِ کسبی ہے اور اگر براہِ راست رُوح (قلب، باطن) پر خدائے علیم کی طرف سے اِلقاء ہُوا ہے تو وہ روحانی اور الہامی علم ہے۔ نبی اور رسول کا روحانی علم یقینی ہوتا ہے کیونکہ نبی و رسول کو اپنے معلّمِ حقیقی خداوندِ علیم کے ساتھ اپنے تعلّق کا واضح اِدراک و یقین ہوتا ہے اور اس کی طرف سے علم و ہدایت کے فیضان کا نبی و رسول کو واضح تصوّر ہوتا ہے۔ لیکن غیر نبی (ولی) کے اِلقاء و اِلہام میں یہ احتمال ہوتا ہے کہ یہ وسوسہ شیطانی نہ ہو یا اس خیال میں خود میری خواہشات کی ملاوٹ نہ ہوگئی ہو۔

یہ اس آخری امّت کی خصوصیّت ہے کہ اس میں علمِ الٰہی کا آغاز علمِ روحانی (علمِ وحی) سے ہُوا۔ وحی قلبِ رسول پر علم کے القاء کا نام ہے۔ پھر رسولِ پاک صلّی اللہ علیہ وسلّم نے علمِ وحی کو تدریس و تعلیم کے ذریعہ پھیلایا اور ساتھ ہی اپنے شاگردوں (صحابہ کرام رضؓ) کے دل میں کتاب و شریعت کے رُموز و حِکَم ڈالے اور یہ کام آپؐ کی روحانی اور قلبی توجّہ سے انجام پایا۔ اسی مفہوم میں علمِ باطن کے لیے علمِ لدنّی اور علمِ وہبی کی تعبیریں استعمال کی جاتی ہیں۔ حضورؐ انہی معنی میں اُمّی تھے کہ تدریسِ کتاب کی احتیاج کے بغیر آپؐ کا سینہ علوم سے منوّر تھا۔ قرآن کریم نے اس الہامی علم (وحی) کو بھی لفظِ علم ہی سے تعبیر کیا ہے۔

حضور علیہ السّلام کو ہدایت کی گئی :

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِىْ عِلْمًا۔ (طٰہٰ : ۱۱۴)

"اور اے نبیؐ! تم قرآن حاصل کرنے میں جلدی نہ کیا کرو، جب تک کہ اس کا نزول (وحی) پورا نہ ہوجائے اور تم دعا کیا کرو کہ اے پروردگار! میری بُوجھ (میرا علم) زیادہ کردے۔"

شاہ صاحب نے اس آیت میں علم کا ترجمہ بُوجھ کیا ہے، کیونکہ اس دُعا کا تعلّق اس ذاتِ گرامی سے ہے جس کا علمِ ظاہری تعلیم و تدریس کے سہارے وجود میں نہیں آیا۔

چنانچہ خدا تعالٰے کی طرف سے رسول پاکؐ پر یہ حقیقت کئی دفعہ واضح کی گئی۔ تعلیم و تدریس کا عام طریقہ یہ ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے ساتھ ساتھ پڑھتا رہتا ہے۔ حضورؐ شروع میں اسی عام طریقہ کے مطابق جبرئیلِ امینؑ سے قرآن پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ خدا تعالٰے نے کئی دفعہ آپ کو سمجھایا کہ قرآن کریم کی تعلیم تمہارے لیے تدریسِ کتاب کے طریقے پر نہیں ہے بلکہ قلبی القاء کے طریقے پر ہے۔ سورۃ القیامہ میں اس کی وضاحت کی گئی:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ، اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَ قُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ۔

(۱۶ - ۱۹)

"اے نبیؐ! تم اپنی زبان کو حرکت نہ دیا کرو تاکہ جلدی سے قرآن حاصل کر لو۔ قرآن کا (تمہارے سینے میں) جمع کرنا اور پھر اس کا پڑھوانا ہمارے ذمّہ ہے۔ پھر جب ہم اسے پڑھ چکیں تو اس کے بعد تم پڑھا کرو۔ پھر ہمارے ذمّہ ہے تمہارے لیے اس کی تشریح کرنا یا دوسروں کے لیے تم سے اس کی تشریح کرانا (بیان کے لفظ میں دونوں مفہوم شامل ہیں)

خدا تعالٰے نے جبرئیلِ امینؑ کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا قرار دیا۔ سورۃ الاعلیٰ (۶) میں بھی یہی فرمایا:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ

"تم کو ہم پڑھا رہے ہیں، پس تم بھول کا شکار نہیں ہو سکتے۔"

جبرئیلؑ کی تلاوت کو اپنی طرف منسوب کرنے میں اسی طرف اشارہ ہے کہ قرآن کی تعلیم عام تدریس کے مطابق نہیں، بلکہ قلبی تعلیم اور الہام کے طریقہ پر ہے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا تعالیٰ کی طرف سے کئی بار وضاحت و تشریح کے بعد عام طریقہ کی ابتدائی عادت کو چھوڑا۔ پھر یہ صورت ہو گئی کہ خدا کی طرف سے قرآن کا طویل سے طویل حصہ جبرئیلؑ سنا دیتے اور اس کے بعد آپؐ تمام نازل شدہ حصہ کو فر فر پڑھنا شروع کر دیتے۔ یہ

بھی ایک معجزہ تھا۔

اوپر ہم نے آیت "فَإِذَا قَرَأْنَاهُ الخ" کا ترجمہ ڈپٹی نذیر احمد صاحب کے ترجمہ کے مطابق کیا ہے۔ عام طور پر "قَرَأْنَاهُ" کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے :۔

"جس وقت پڑھیں ہم اس کو پس پیروی کر پڑھنے میں ہماری۔"

(شاہ رفیع الدینؒ)

"پھر جب ہم پڑھنے لگیں تو ساتھ رہ اس کے پڑھنے کے" (شاہ عبدالقادرؒ)

"تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں تو اس کے تابع ہو جایا کیجیے۔" (مولانا تھانویؒ)

فارسی کے حضرات اتباع کے لغوی مفہوم کی پابندی کر رہے ہیں :۔

پس پیروی کن خواندنِ او۔" (جرجانی)

"در پے خواندنِ او کُن۔" (شاہ ولی اللہؒ)

اردو والے اس ترجمہ کی پیروی سے باہر نہیں جا سکے، لیکن ادنیٰ تأمّل کرنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ تو پڑھنے کا وہی انداز ہے جس سے آپؐ کو روکنا مقصود ہے۔ یعنی دو دو لفظ یا ایک ایک آیت جبرئیلؑ تلاوت کریں اور آپؐ اس کی پیروی کریں۔ اس اشکال سے بچنے کے لیے ڈپٹی صاحب نے "پڑھ چکیں" ترجمہ کیا۔ ہندی کا لفظ "چکنا" اردو میں ختم ہونے اور مکمل ہونے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ دلی والے اس لفظ کو تابع فعل کے طور پر اتمامِ فعل کے لیے لاتے ہیں اور کبھی تاکیدِ فعل بھی مقصود ہوتی ہے۔ داغ کہتے ہیں : ؎

بڑھایا ہم نے دل اس کا یہ کہہ کہہ کر دمِ بسمل ۔۔۔ لگا چک تیغ اے قاتل، کہیں قاتل بھی ڈرتے ہیں

گلی سے یار ہم اٹھ کے چل چکے تھے مگر ۔۔۔ مچل گیا دلِ پُر اضطراب رستے میں

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اتباع کے لغوی مفہوم کو بالکل چھوڑ دیا اور اس کا تفسیری اور تاویلی ترجمہ اختیار کیا۔ جو تمام مفسرین نے اختیار کیا ہے۔ یعنی اتباع بمعنی استماع ۔ لکھتے ہیں :

"لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں اس وقت تم اس کی قرات کو غور سے سنتے رہا کرو۔" (مختصر تفہیم صہ ۹۰۶)

(باقی صفحہ ۷ پر)